میری لائبریری سے

دلّی کی خواتین کی کہاوتیں اور محاورے، مصنفہ بیگم شائستہ اکرام اللہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس

زبان کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر سو یا دو سو سال تک اپنا لب ولہجہ ہی نہیں بدلتی بلکہ اس میں بہت سے نئے الفاظ ،محاورے شامل ہو جاتے ہیں ، پرانے الفاظ اپنے معنی کھو دیتے ہیں اور ان کا مفہوم جاننے کے لئے لغات کھنگالنا پڑتی ہیں۔قیام پاکستان کے دنوں کے مشہور شاعر فراق گورکھپوری کا شعر پڑھنے اور سر دھننے کی بجائے مطلب ڈھونڈیئے یہ اردو زبان کا شعر ہے اسی صدی کے آغاز کی اردو اور اب بولے جانے والی اردو کا تقابلی جائزہ لیجئے۔

؎ اگن کنڈ ہے سینہ فراقؔ
دیئر دیئر جلتی ہے آگ

(فراق کا سینہ آگ کا کنواں ہے جس میں تیری یادیں دھڑ دھڑ کر کے جلتی ہیں)

بہر حال آمدم برسرِ مطلب کچھ محاورے کچھ کہاوتیں ایسی ہوتی ہیں جو سدا زندہ رہتی ہیں۔ان سے ایک شاندار روایت، عظیم ماضی کی جھلک ہی نہیں ملتی ،اس پورے ماحول کی عکاسی ہوتی ہے۔ایسی ہی ایک ننھی منی کتاب میرے ہاتھوں میں ہے ''دلّی کی خواتین کی کہاوتیں اور محاورے''اس کتاب کو پڑھ کر میرا وہ ماضی پھر سے زندہ ہو گیا جس میں رشید احمد صدیقی ، شاہد احمد دہلوی جیسے قلم کار اپنی دلچسپ زبان وبیان سے قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتے تھے اور جب بیگم شائستہ اکرام اللہ کا تعارف میرے پاس رٹے رٹائے ان فقروں میں تھا کہ'' وہ تحریک پاکستان کی ایک نامور خاتون رہنما تھیں'' تو اس کتاب کو پڑھ کر میری معلومات میں بہت خوشگوار اضافہ ہوا۔ڈاکٹر اسلم فرخی اس کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

''بیگم شائستہ نے میکے میں جو کچھ سیکھا اور حاصل کیا سسرال میں اس پر جلا ہوئی ۔شوہر کا تبادلہ لندن ہوا تو ساتھ گئیں'' اردو ناول اور مختصر افسانے'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ۔لندن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے والی وہ پہلی مسلمان خاتون تھیں۔

یہ چھوٹی سی کتاب بیگم صاحبہ کی لسانی فکر، اردو زبان سے بے پناہ لگاؤ، پاکستان کے موجودہ لسانی الجھاؤ کے ماہرانہ تجزیئے پر مبنی ہے آج سے ساٹھ ستر برس قبل عورتوں کی بامحاورہ اور خوب صورت زبان آمیزش سے پاک ہونے کی وجہ سے مستند اور ٹکسالی سمجھی جاتی تھی الفاظ کی سند شعرا کے کلام یا عورتوں کی زبان سے فراہم ہوتی تھی ۔ چونکہ عورتوں کی زبان بیرونی اثرات سے پاک ہوتی تھی لہٰذا اسے اہمیت دی جاتی تھی آہستہ آہستہ پرانی بڑی بوڑھیاں غائب ہو گئیں یا خاندانوں پر ان کے اثرات کم ہوتے گئے ۔خواتین روز بروز انگریزی تہذیب کی دلدادہ ہوتی گئیں۔جو خواتین اب مائیں یا نانیاں، دادیاں ہیں وہ انگریزی محاورے سے تو کسی حد تک آشنا ہیں لیکن اپنے محاورے سے بے بہرہ ہو گئی ہیں اور ان نسلوں کی پرورش کے لئے مائیں انگریزی کا سہارا لینے پر مجبور ہیں۔''

قارئین دیباچے کا یہ نکتہ میرے ذہن پر ایک بم دھماکے کی طرح لگا ہے ۔واقعی تہذیب ایک دم نہیں آہستہ آہستہ رنگ روپ چھوڑتی ہے ۔بیت الخلا سے لیٹرین ، لیٹرین سے ٹوئلٹ اور ٹوئلٹ سے باتھ روم اور پھر واش روم کا سفر ہمیں ہماری حقیقت سمجھاتا ہے ۔ اور تو اور بہت سے دیندار گھرانوں کی مائیں اس سفر میں بغیر سوچے سمجھے امی ،اماں یا ماں جی سے ماما اور ابو یا ابی جان سے ڈیڈی اور پاپا تک پہنچ گئے ..... یہ خیال ہی نہ کیا کہ امی سے ماما محض الفاظ کی تبدیلی

نہیں لسانی بے راہ روی ہے۔

بیگم شائستہ اکرام اللہ نے لسانی بے راہ روی کے اس دور میں دلّی کی خواتین کی کہاوتوں اور محاوروں کو مرتب کر کے اس تہذیب کے ذریعہ اظہار کو محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔ پیارے قارئین کتاب کے پیش لفظ میں بیگم صاحبہ کی زبان ایسی ہے کہ پڑھنے والے کو مزہ آجائے لکھتی ہیں!

''کہاوت کا ایک جملہ مدتوں کے تجربے کا نچوڑ ہوتا ہے ان محاوروں کے ذریعہ تجربے کی ہزاروں باتیں ذہن نشین کرائی جاتی تھیں۔ دنیا کی اُونچ نیچ، نفع نقصان سمجھایا جاتا تھا۔ اس زمانے کی عورتوں کا یہ خاصہ تھا کیونکہ دل کی بھڑاس نکالنے کا یہ واحد ذریعہ تھا۔ ان کہاوتوں کے ذریعے نو دو لتیے لوگوں کے خوب لتّے لیے جاتے ان کے یہاں کی عورتیں اگر نزاکت کا اظہار کریں تو طنزاً انہیں نازک بیگم یا مہین بیگم کہا جاتا۔

امیری غریبی پر بھی بہت کہاوتیں تھیں۔ ''مرا ہاتھی سوا لاکھ کا'' اور بڑے دیگ کی کھرچن بھی بہت ہوتی ہے'' یعنی پشتینی امیر چاہے کتنا ہی گیا گذرا ہو پھر بھی اس کے گھر میں امیری کی نشانی کچھ نہ کچھ باقی ہو گی جیسے بیش قیمت تلوار نوادرات، زیورات، چاندی سونے کے ظروف وغیرہ۔

ہنر سلیقہ عورت کا زیور سمجھا جاتا اس لئے قدم قدم پر اس کی تعریف کی جاتی اور پھوہڑ پن اور بدسلیقی پر خفگی ہوتی۔ لڑکیوں کی عادت تیزی سے چلنے کی ہوتی ہے اس طرح جلدی میں ٹھوکر لگ جاتی یا دھچکا لگنے سے چیز ٹوٹ جاتی اس پر ماں خالہ طنزاً کہتیں ''گھڑ بہو چلے ستر گھر ہلے'' کنواری لڑکیاں اگر بڑوں کے بیچ دخل دیں، بولیں یا بات کاٹیں تو فوراً ڈانٹ پڑتی اور کہا جاتا ''زبان کا ٹانکا ٹوٹ گیا ہے''۔ اسی طرح آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کرنے پر کہا جاتا ''آنکھ کا پانی مر گیا ہے''۔ تیز طرار لڑکی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھی جاتی تھی بلکہ ''منہ پھٹ پکی پکوٹا'' کہلاتی یہ بھی کہا جاتا ''ذرا دیکھو ٹانگ برابر لڑکی کیسی دیدہ دلیری سے باتیں کر رہی ہے''۔

طعنہ اور طنز میں بھی حفظ مراتب کا خیال رکھا جاتا اپنے سے بڑے کے سامنے طعن اور تشنیع کا تو کیا ذکر ان کے سامنے زبان تک کھولنا عیب سمجھا جاتا۔ کوئی مہمان تھوڑی دیر آنے کے بعد جانے کو کھڑی ہو جائے تو کہا جاتا '' اے ہے کیا راستہ ناپنے آئیں تھیں.....'' اپنی عمر کے لحاظ سے زیادہ ہار سنگھار کرنے والی کو ''بڈھی گھوڑی لال لگام'' یا ''بوڑھے منہ مہاسہ لوگ دیکھیں تماشہ'' کی پھبتی کسی جاتی، دن چڑھے تک کنگھی کئے بغیر پھرنے والی لڑکیوں کو ''سر جھاڑ منہ پہاڑ'' اور دن چڑھے تک سونے والیوں کو یہ کہہ کر جگایا جاتا ''اٹھو بھی کیا، مردوں سے شرط باندھ کر سو رہی ہو'' سرِ شام سونے والیوں پر طنز کی جاتی ''ان کا کیا کہنا چراغ میں بتی پڑی میری لاڈو تخت چڑھی''۔

دو بہت موزوں کہاوتیں میں نے لیڈی واستوا کی زبانی سنی تھیں۔ ان کی لڑکی شیلا، میں اور دو ایک اور لڑکیاں سیسل ہوٹل شملہ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے ہم سب کا کہنا یہ تھا کہ ہمیں کسی کے کہنے سننے کی پروا نہیں جب ہم کوئی غلط بات کرتے نہیں تو پھر ڈر کا ہے کا؟ اس پر لیڈی واستوا بڑے دھیرے سے بولیں ''بیٹی بد بھلا بدنام بُرا.....'' ان کا کہنا کتنا صحیح تھا یہ عمر اور تجربہ کے بعد احساس ہوا۔ لوگ بہت برے کام کر کے پار ہو جاتے ہیں اور کسی کو اس کا پتہ نہیں چلتا کوئی ان کو بُرا نہیں کہتا اور دوسرے ذرا سی غلطی کر کے بے پروائی کی وجہ سے بدنام ہو جاتے ہیں اور نقصان اٹھاتے ہیں۔

چھوٹے بڑوں کو بہت ادب سے سلام کرتے تھے بڑے ان کا جواب دعائیہ جملے سے دیتے۔ آداب عرض، تسلیمات عرض ہے، بزرگوں کے آگے اظہار ادب کے جملے تھے مگر اب متروک ہو چکے ہیں بقول توبۃ النصوح کے کلیم کے بس ''السلام علیکم'' کا ڈھیلا پھینک مارتے ہیں۔ مسز چھتاری کہا کرتی تھیں ''نہ سر جھکتا ہے نہ ہاتھ اٹھتا ہے سارا اسلام السلام علیکم میں آ گیا ہے''۔ جب حفظ مراتب کا زمانہ تھا دعائیہ جملے یہ تھے ''جیتے رہو، سلامت رہو، ہزاری عمر ہو''.....، عورتیں بچوں کو یوں دعا دیتیں ''جیتے رہو، زندہ رہو، ماں باپ کا سایہ سر پر قائم

رہے'' کنواریوں کے لئے ''خدا قسمت اچھی کرے'' بیاہیوں کے لئے ''خدا سہاگ قائم رکھے، گود بھری رہے......''

زبان کی ہزاروں گردانیں تھیں۔ موقع محل دیکھ کر اونچ نیچ سمجھ کر بات کرنا تہذیب اور شائستگی کی دلیل تھی۔ زبان کھولتے ہی پتہ چل جاتا کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ لب ولہجہ اس کی غمازی کرتے، بولنے والے کا تعلق کس علاقہ اور کس طبقہ سے ہے، پڑھے لکھے ہیں یا جاہل، غرض سارا پول ایک زبان سے کھل جاتا۔

میری شادی ہوئے ابھی تھوڑے دن ہی ہوئے تھے کہ ایک بیگم صاحبہ آپا یعنی میری نند سے ملنے آئیں۔ انہوں نے طنز یہ لہجہ کی آمیزش سے پوچھا، ان کی شادی کیسے ہوئی؟ آپ کی رسمیں الگ ان کی رسمیں الگ۔ آپا نے ایک دفعہ تو سیدھے سبھاؤ جواب دے دیا، دونوں خاندانوں کو جاننے والی ایک دوست خاتون تھیں ان کے ذریعہ سے نسبت ٹھہری مگر ان بیگم صاحبہ کو اطمینان نہیں ہوا وہ یہی الفاظ دہرائے جارہی تھیں پھر آپا کو غصہ آ گیا وہ سنبھل کر بیٹھیں اور بولیں ''دیکھئے صاحب فضول رسمیں تو اب کہیں بھی نہیں ہوتیں، باقی رہ گیا ایک نکاح سو وہ ان کے یہاں بھی ہوتا ہے ہمارے یہاں بھی''۔ اس زمانہ میں ماماؤں (ملازماؤں کو ماما کہتے تھے) کی زبان میں ایک خاص چٹخارہ ہوتا تھا خاص کر کے جب وہ آپس میں لڑ پڑتیں ایک دوسرے کو گالیاں دیتیں۔ اکثر دکھیاری ہوتیں اس لئے خود کو جنم جلی، نصیب کی کھوٹی کہتیں اپنی قسمت پر ٹھنڈی سانس بھرتیں۔

ے لکڑی جل کوئلہ بھئی کوئلہ جل بھیو راکھ
میں پاپن ایسی جلی نہ کوئلہ بھئی نہ راکھ

بیگم صاحبہ کے بخل پر کہتیں ''توبہ ہے! جو فقیر کو بھی جھوٹا ہاتھ ماریں یا بے جا کفائت شعاری پر کہتیں ''تو کونہ موکو چولھے میں جھونکو''۔

میری اماں کوسنوں کے سخت خلاف تھیں ہمارے گھر کے اندر کسی ماما کو کوسنے کی اجازت نہ تھی اماں کا کہنا تھا جو کسی کو کوستا ہے تو وہ بد دعا چوبیس گھنٹہ تک آسمان زمین کے درمیان گھومتی رہتی ہے اگر حق پر ہو تو جسے کوسا گیا ہے اس پر، ورنہ کوسنے والے پر پڑتی ہے اسی لئے کوسنا نہیں چاہیے کیونکہ غصہ میں حق ناحق کی تمیز نہیں رہتی۔ گالی دینا شریفوں کا شیوہ نہیں۔ ابھی میں بہت چھوٹی تھی تب میرے ابا نے مجھے بتایا کہ میرے دادا اگر زیادہ ناراض ہوتے تو کہتے فلاں شخص نامعقول ہے۔

بیویوں کے خفگی کے الفاظ بھی بندھے ٹکے تھے۔ نامراد، کمبخت، ناشدنی، جہنم میں جاؤ، دفع ہو جاؤ وغیرہ۔

بعض فقرے خالصتاً زنانہ تھے مرد کبھی ان کا استعمال نہ کرتے جیسے نوج، خدا کی سنوار، تمہارے منہ میں خاک وغیرہ۔

نباہ دینا یہ فقرہ ہماری تہذیب کی قدروں کا آئینہ دار ہے۔ نباہ دینا شوہر اور سسرال والوں کے ظلم وزیادتی کو صبر سے برداشت کرنے کا نام ہے یہ شکوہ شکایت کئے بغیر زندگی گزارنے کو کہتے ہیں۔ نباہنے میں ایک وقار ہوتا ہے، خوبصورتی ہوتی ہے اسکے ساتھ ایک جملہ بیبیاں اور کہتیں ''نیک کوکھ کی بیٹی ہے اسی نے نباہ دیا''۔

جب خواتین نے پہلے پہل مضمون نگاری شروع کی تو اپنا نام تک نہیں لکھتی تھیں کیونکہ عورتوں کے نام کا بھی پردہ تھا۔ باپ بھائی یا شوہر کے نام کے حوالہ سے ان کے مضامین چھپتے۔ نذر سجاد حیدر صاحبہ کے بنت نذر الباقر، ان کی پھوپھی کے ہمشیرہ نذر الباقر اور پھر والدہ افضل علی کے نام سے چھپے۔

جس طرح مطلب ادا کرنے کے لئے خواتین کہاوتوں کا سہارا لیتی تھیں، مرد شعر کا سہارا لیتے لیکن عورتیں شاعری سے نابلد نہیں تھیں اس دنیا اور اس ماحول سے وہ دنیا بہت دور معلوم ہوتی ہے جہاں چاندنی رات میں آنگن میں تخت پر بیٹھ کر شعر و شاعری اور بیت بازی کی جاتی، قصے کہانیاں سنی کہی جاتی تھیں۔''

تو پیارے قارئین! یہ وہ کتاب تھی جس کے کچھ فقرے چن چن کر ہم نے آپ کی خدمت میں پیش کر دیئے باقی رہے فقرے پڑھنے کے لئے کتاب خرید یئے اور کتاب دوست بنیے۔ اللہ حافظ!